تفسیر
سورۂ اخلاص

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

بنام خدائے ہمہ مہر و مہربان

۱۔ قرآن پاک ایک ایسا کلام ہے کہ اسے نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں، اور نہایت چھپا اور مشکل بھی۔ خدائے پاک کو دیکھو کہ سب اسے جانتے ہیں اور پھر کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود اپنے آپ کو سوچو کہ اور کسی چیز میں شک ہو تو ہو مگر اپنی ہستی میں کبھی شک نہیں۔ مگر پھر دیکھو تو بقول غالب ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

قرآن خود بھی اپنے تئیں کھلا اور آسان بتاتا ہے مگر دوسرے لحاظ سے مستور و عمیق، اسی طرح خدائے پاک کی نسبت، کہتا ہے کہ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

۲۔ ظاہر ہے کہ دو متناقض باتیں اگر ایک ہی جگہ پائی جاتی ہیں تو ضرور یہ اجتماع النقیضین دو مختلف پہلوؤں سے ہوگا۔ پس قرآن پاک کا آسان اور مشکل دونوں ہونا ضرور دو حیثیت سے ہوگا۔ چنانچہ ضروری اور عام تعلیم کے لحاظ سے وہ نہایت آسان ہے مگر اعلیٰ تعلیم اور دقیق مضامین کے لحاظ سے نہایت مشکل ہے اور یہی مناسب بھی ہے کیونکہ جو لوگ اعلیٰ ترقی کی لیاقت تک نہیں پہنچے ان کے لیے وہ مضامین اگر ظاہر بھی کر دیے جائیں تو بھی نہ تو وہ اسے سمجھ سکیں گے اور نہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے بلکہ ان کے فائدہ اٹھانے کی قابلیت کو بھی نقصان پہنچے گا۔ یہ اس لیے کہ دین کا راستہ سیر باطن ہے۔ سیر باطن تفکر اور تدبر سے ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کو وہ باتیں جو وہ غور و فکر سے حاصل کر سکتا ہے پہلے ہی بتا دی جائیں تو اس کی قوتِ فکر ضائع ہو جائے گی اور اس بتائی ہوئی بات کو بھی اس تیقن کے ساتھ نہیں سمجھے گا جیسا کہ چاہیے اور آئندہ کی ترقی سے محروم رہے گا۔ اسی لیے خدائے تعالیٰ نے نظامِ عالم میں کوشش کو ضروری قرار دیا تاکہ انسان اپنی اعلیٰ ترقی تک پہنچ سکے۔ تعلیم میں اس پہلو کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے، ورنہ تعلیم ایک لفظ بے معنی ہوگا کیونکہ قوائے عقلیہ کے بے کار ہونے سے وہ علم بے ثمر ہوگا۔ یہ بات تو علم ظاہری کی ہے۔ علمِ باطنی کو اس سے کچھ زیادہ خیال کرو کیونکہ اس میں جاننا اسی کا نام ہے جس کو ہونا کہتے ہیں۔ اچھی اور بری کو جاننا اور پھر رغبت اور نفرت کا نہ پیدا ہونا یہ جاننا دین میں مسلم نہیں، حکیم بھی اگر محض نام کا حکیم نہیں تو ایسی ہی سمجھتا ہے۔ سقراط سر آمد حکمائے یونان کا یہی مذہب تھا اور وہ گناہ اور جہل کو ہم معنی کہتا تھا۔

۳۔ پس عام حکمتِ الٰہی کے موافق جس پر مدارِ ترقی انسانی ہے۔ قرآن کو محلِ تدبّر اور تفکّر بتایا گیا اور ظاہر کو بتا کر باطن کی طرف متوجہ کیا گیا۔ خداوند تعالیٰ ہم کو ابتدائی نعمتیں عطا کر کے انتہائی نعمتوں کی طرف رہبری کرتا ہے اور پھر جوں جوں ہم کوشش کرتے جاتے ہیں انعام کے مستحق ہوتے جاتے ہیں اور یہی عدل ہے ورنہ کیوں فرقِ مراتب ہے۔ پس اسی طرح فہم قرآن میں جوں جوں انسان ترقی کرتا

جائے گا، اس پر اسرار کھلتے جائیں گے اور ایسے نمایاں طور پر کہ وہ ان کے سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہوگا۔ پس درحقیقت یوں کہنا ٹھیک ہوگا کہ قرآن اپنے دقیق مضامین کے لحاظ سے بھی صاف اور آسان ہے کہ اس کا چھپا ہونا محض اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ابھی ہم پیچھے ہیں۔ چنانچہ خود قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ "جو لوگ روشنی قبول کرتے ہیں خدا ان کی روشنی زیادہ کرتا ہے۔" عام تعلیم میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ کیسی ہی صاف تحریر ہو ابجد خواں کے لیے وہ پیچیدہ ہے مگر ایک ماہر کے نزدیک اس کو پیچیدہ کہنا صریح ظلم ہوگا۔ قرآن نے اپنی اس صفت کو کہ وہ ایک عمیق اور مکنون کلام ہے خود بتا دیا ہے۔ پیشانی کتاب پر تین حرف ایسے لکھ دیے کہ جن کے معنی اب تک باوجود اس قدر کوشش کے ظاہر نہ ہوئے گویا کہ اس معنوی راہ کے اول ہی قدم پر یہ کتا بہ لگا دیا کہ ع

ہشدار کہ رہ بردم تیغست قدم را

اور نہ صرف اول میں بلکہ اور بھی جا بجا منزلوں کے سرے پر ایسی ہی کتابہ آویزاں کر دیا کہ مبادا اگر راہ گیر ایک جگہ بھول گیا تو دوسری جگہ ضرور خیال کرے۔

۴۔ پس قرآن نے صاف طرح پر اعلان کر دیا۔ اس دریا سے بقدر اپنے ظرف کے پانی لے لو تمام دریا کو اپنی کلھیا میں بھرنے کی ہوس نہ کرو صحابہ اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر کسی جگہ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو خواہ مخواہ اس میں الجھتے نہ تھے۔ یہ اس لیے تھا کہ بقدر ہدایت قرآن نہایت کھلا تھا۔ دریا سے عبور کر کے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچتے تھے مگر اس کی تمام وسعت کو ناپنے کی تمنا نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ اسے غیر محدود اور ناپیدا کنار جان گئے تھے۔ ہاں ہر شخص بقدر اپنے فہم اور قوتِ فکر کے اس سے جواہر نکالتا تھا اور عام شاہراہ سے ادھر ادھر جو دلکش جزیرے واقع تھے ان کا انکشاف کرتا تھا جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ اس دریا کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے۔"

۵۔ جو لوگ قرآن کو ایک معمولی کلام خیال کرتے ہیں اور اپنی لیاقت کو جتنی ہے اس سے زیادہ سمجھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ فہم قرآن کے لیے کافی ہے، وہ قرآن کے معنی سے بالکل محروم رہتے ہیں۔ ان میں سے بعضے اپنی کج فہمی کا نام اعتراض رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب والے جو قرآن کو کچھ تھوڑا بہت سمجھتے ہیں، وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ اس کو سمجھنے کے لیے یہ پہلا امر ہے کہ اسے ایک اعلیٰ کلام مانا جائے۔

قرآن پاک نے بھی اپنی نسبت مختلف جگہ یہی کہا ہے کہ انکار کرنے والا اس کو ہرگز نہیں سمجھے گا۔ حضرت عیسیٰؑ سے جب ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ آپ بذریعہ تشبیہات کیوں تعلیم دیتے ہیں تو یہی فرمایا "تاکہ یہ بات منکروں پر پوری ہو کہ سنتے ہیں اور نہیں سنتے اور دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے" قرآن اپنی نسبت کہتا ہے کہ "اس سے بدکاروں کی گمراہی اور بڑھ جاتی ہے۔" چنانچہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا کہ حق کو جب ظاہر کیا گیا ہے تو وہ لوگ جو حق کے ماننے کے لیے آمادہ تھے انھوں نے بے تکلف اسے مان لیا اور حق کے راستہ پر چل کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔ جس نے پس و پیش کیا اس نے اپنی منزل کھوئی اور جس نے منہ پھیر لیا وہ اندھا ہو گیا۔ کیونکہ جس عقل کو وہ ہر کام میں اپنا رہنما بناتا تھا جب اسی عقل نے حق کی گواہی دی تو وہ اس سے بیزار ہوا اور کہنے لگا کہ اس کلام میں جادو ہے کہ میری سمجھ الٹی ہوئی جاتی ہے۔ پس عقل پر خواہش کو مقدم رکھا اور لگا فضول شبہے اور بے کار حیلے ڈھونڈھنے تاکہ اپنی حماقت پر ذرا پردہ ڈال دے کیونکہ فطرت کو تاریکی سے خود نفرت ہے۔ پس جب اس نے اس طرح عقل کی آنکھ پر پٹی باندھ لی تو ظاہر کہ جو کچھ رہی سہی روشنی تھی اسے بھی کھو بیٹھا۔ اس حالت کو قرآن پاک نے اکثر جگہ بیان کیا ہے اور انجیل میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ○ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ○ لَمۡ یَلِدۡ ۙ○ وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ ۙ○ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ○

کہہ کہ وہ اللہ، بے ہمہ ہے، اللہ باہمہ ہے، نہ وہ باپ ہے، نہ وہ بیٹا، نہ کوئی اس کی برابری کا ہے۔

۱۔ (وہ) یعنی جس کی ہم بندگی کرتے ہیں،
(بے ہمہ) سب سے نرالا، اکیلا۔

۲۔ (باہمہ) سب کا مقصود، سب کا ملجا،

۳۔ اللہ کا مفہوم باپ کے مفہوم سے برتر اور محبوب تر ہے۔

۴۔ بیٹا ہونا زبردستی کے بغیر نہیں، اور خدائی مفہوم کے بالکل خلاف ہے۔

۵۔ برابری: ذات، برادری، (سے پاک ہے کوئی اس کے جوڑ کا نہیں، سب مخلوق وہ خالق، سب محتاج وہ تونگر، سب اس کے آگے سربسجود، اور وہ تنہا مسجود، سب باطل، اور وہی تنہا حق)

(مَضۡمُوۡنُ سُوۡرَۃ عَلٰی سَبِیۡلِ الۡاِجۡمَال)

۱۔ محبت

جس طرح ہر ایک کام کی ایک غرض اور انتہا ہوتی ہے جس پر وہ کام ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح ایمان اور تعلیم قرآن کی انتہا محبتِ الٰہی ہے، تمام نبیوں کی تعلیم کا مرکز اور مغز یہی تھا، اور روحانی زندگی اسی کا نام ہے (زیادہ شرح سورۂ فاتحہ میں دیکھنی چاہیے) قرآن تو اس تعلیم سے لبریز ہے، مگر توریت اور انجیل میں بھی یہ حکم صاف صاف سنا دیا گیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ توریت کے احکام میں سب سے اعلیٰ حکم کیا ہے تو فرمایا "خدا کی محبت تمام دل تمام روح، تمام عقل سے کرنا یہی سب سے اول اور اعظم حکم ہے۔" (متی ۲۲)

۲- اخلاص

جس طرح محبتِ الٰہی دین کی غایت ہے، اسی طرح اس محبت کی جان اخلاص ہے۔ منہ سے محبت کا دم بھرنا اور چیز ہے اور اخلاصِ محبت اور سے

خلقے زباں بدعویٔ عشقش کشادہ اند   اے من غلامِ آنکہ دلش بازباں یکے است

اسی لیے توریت اور انجیلوں میں اس قدر تاکید سے کہا گیا کہ پورے تمام دل اور تمام روح اور تمام عقل سے ہو۔ بے شک یہ تعلیم بحیثیت ایک عملی فرمان کے کافی ہے۔ اگر اس کے ساتھ علمی پہلو بھی ہوتا یعنی یہ کہ ہمیں ایسا کیوں کرنا چاہیے تو کچھ اور بڑھانے کی ضرورت نہ تھی، قرآنِ پاک نے اس تعلیم کو مکمل کیا ہے اور اس تکمیل کو اس لیے اٹھا رکھا تھا کہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آغازِ طفلی میں بچہ کی تعلیم کان اور زبان سے نہیں بلکہ آنکھ اور اشاروں سے ہوتی ہے، جب وہ سخن آشنا ہوا تو امر و نہی اور امید و بیم کے قریب الوقوع وعدوں سے کام لیا جاتا ہے، لیکن جب وہ زیورِ عقل سے آراستہ ہوا تو اس سے کسی کام کو بے سمجھے کرنے کی توقع رکھنی عبث ہے، کام کی ذاتی خوبی اور اس کے نتائج بعیدہ کا ظاہر کرنا ضروری ہوگا، پس محض ایک عملی فرمان اسی زمانہ کے لیے مناسب ہوگا جب کہ عام امت کی عقل ہنوز بچپن کی حالت میں ہو اور نبی کے حکم کو بے سمجھے مان لیتے ہوں، جب کہ مناسب یہ ہو کہ بجائے دلائل کے معجزے کام میں لائے جائیں اور جب کہ یہ ضرور ہو کہ معلم کا عصا ہمیشہ ان کے سر پر رہے، جب کہ یہ حالت ہو کہ استاد ذرا آنکھ سے اوجھل ہو تو باوجودیکہ عظیم الشان معجزے دیکھ چکے ہوں ایک بچھڑے کو خدا بنا لیں[1] جب کہ ناصحِ شفیق آخری شب میں فرضِ شفاعت ادا کرنے کے لیے ان سے دعا میں ہمدمی چاہتا ہو تو بچوں کی طرح سو سو جائیں اور بالآخر وہ یہ جانکاہ فقرہ کہہ کر کہ اب خوب سوؤ[2] انھیں ادھورا[3] چھوڑ کر رخصت ہو جائے۔

مگر جس وقت بچپن گزر گیا ہو اور عقل کے بلوغ کا زمانہ آ گیا ہو جب کہ معلم اس کو مکتب سے آزاد کرنا چاہے اور شاگرد کو سندِ تکمیل دے کر استاد بنانا چاہے تو اس وقت حکم کے ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہے، اور قواعد کے ساتھ حجت کی بھی حاجت ہے تاکہ درختِ علم آبِ علم سے ہمیشہ سیراب رہے اور قصرِ ہدایت مثلِ کوہِ راسخ کے ہمیشہ کی مرمت سے بے نیاز ہو جائے اور جو بشارت کہ حضرت کلیم اور حضرت مسیح علیہما السلام تکمیلِ حکمت کی دے گئے تھے وہ پوری ہو۔

عمل کی بنیاد جس وقت علم پر قائم ہو جاتی ہے تو بوجہ استحکام کے اس کو حکمت کہا جاتا ہے اور بوجہ اس کے کہ دل اور روح اور عقل سب کو اس سے تشفی ہو جاتی ہے اس کا نام سکینت اور ایمان ہے، لیکن اگر عمل کی بنیاد علم پر نہیں ہے تو وہ نقش بر آب ہے، نہ اسے کوئی معجزہ قائم رکھ سکتا ہے اور نہ کوئی وعدۂ حور و قصور، اور اگر اس کا وجود بظاہر نظر آتا ہو تو وہ محض سراب کی نمائش ہے۔

---

[1] بنی اسرائیل کے قصہ کی طرف اشارہ [2] نصاریٰ اور حضرت عیسٰی کے حواریوں کی طرف اشارہ، کہ حضرت کی گرفتاری کی شب میں جب وہ ان سے اپنی دعا کے ساتھ ہمدردی چاہتے تھے تو وہ سو گئے تھے۔ [3] حضرت عیسٰی نے اپنی تعلیم کو ادھوری کہا ہے اور فرمایا کہ جب آخری پیغمبر آئے گا تو اسی ادھوری تعلیم کو پوری کرے گا۔

ع   برعکس نہند نام زنگی کافور

قرآن پاک نے مثال دی ہے کہ "ایک پاکیزہ بات مثل ایک پاکیزہ درخت کے ہے جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخ آسمان میں ہو، خدا کے حکم سے ہر وقت میوہ دیتا ہو" یعنی کلمۂ حق دل و جان میں پیوند ہو کر ہمیشہ اپنا نتیجہ شیریں بخشتا رہتا ہے۔

۳- تکمیلِ علم کے لیے معرّف اور حجّت کی ضرورت

جس طرح عمل کی بنیاد علم پر ہے، اسی طرح علم کی بنیاد، معرف اور حجت پر ہے یعنی ٹھیک پہچاننا اور سمجھ کر ماننا زیادہ سادہ لفظوں میں "کیا" اور "کیوں" کا جواب معلوم کرنا "کیا" کا صحیح جواب معرف ہے اور "کیوں" کا صحیح جواب حجت، معرف سے صحیح تصور حاصل ہوتا ہے اور حجت سے صحیح تصدیق۔

قرآن پاک اپنے طرز بیان سے بھی اکثر یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ صحیح تصور کا نتیجہ صحیح تصدیق ہے اور صحیح تصدیق کا ضروری نتیجہ درستی عمل ہے۔ چنانچہ ہمیشہ ایمان کے ساتھ عمل کو بطور نتیجہ کے ذکر کیا گیا ہے، تاکہ اگر عمل اس سے پہلو بہ پہلو نہیں تو سمجھ لو کہ ایمان بھی برائے نام ہے۔ یہودیوں کے دعوائے ایمان اور نافرمانیوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا کہ کیا کچھ برائیاں تم سے ایمان کرواتا ہے، اگر (اگر مان لیں کہ) تم مومن ہو (سورہ بقر) یعنی تمہارا دعوئ ایمان غلط ہے، اور اس ایمان کو ایمان کہنا تمہاری ہی اصطلاح ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، اور اس نام کے ایمان سے کیسی کچھ نالائقیاں سرزد ہوتی ہیں۔

فائدہ معرّف

معرف علم کی ابتدا ہے یعنی جب تک کسی شے کو یہی نہ جانو کہ وہ ہے کیا اس وقت تک اس کے متعلق اور کیا علم حاصل کر سکو گے، کیونکہ اگر ابتدا ہی میں ذرا بھی کجی رہی تو ہر ایک قدم پر اصلی علم سے دور ہوتے جاؤ گے، اور تاریکی پہ تاریکی چھاتی جائے گی، بنیاد کی غلطی ذرا بھی ہو تو بھی بہت بڑی ہے۔ ایک ہی نقطہ سے دو خط کھینچو جن میں بال برابر فاصلہ ہو، پھر دیکھو کہ جوں جوں وہ آگے بڑھتے جائیں گے ان میں فاصلہ زیادہ تر ہوتا جائے گا۔

خشت اول کو نہد معمار کج   تا ثریا مے رود دیوار کج

لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ تمام مذاہب باوجود ان کے باہمی سخت اختلافات کے ایک ہی مرکز پر پہنچتے ہیں، یہ بات ایک پہلو سے صحیح بھی ہے مگر دوسرے پہلو سے بالکل غلط اور اکثر لوگ اسی غلط پہلو کو سمجھتے ہیں۔ مذہب کی ابتدا بے شک ایک ہی ہے مگر ان کے انتہا میں مثل انھیں دو خطوں کے جو ایک نقطہ سے نکلے ہوں بے انتہا فرق ہے۔ ایک ہی شہر سے دو مسافر چلے، ایک نے پچھم کا رخ کیا، دوسرے نے اُتر کو، یہی حال اختلاف مذاہب کا ہے۔ اسی لیے اگر کوئی شخص ہر مذہب میں سے جزئیات اور زوائد کو دور کرنا چاہے اور محض ان کے کلیات اور اصول تک پہنچے تو اسے سب ایک معلوم ہوں گے مگر یہ وہی کر سکتا ہے جو تقلید سے بالکل پاک ہو اور نہ صرف آبائی مذہب کا بلکہ ہر ایک مذہب کا ایک وقت منکر ہو، یہ ایک ایسا مشکل کام ہے جس کا متحمل شاید ہی کوئی نیک دل شخص ہو۔ تقلید کی حالت میں وہ اصل اور زوائد میں فرق نہیں کر سکے گا، اور اس فرق نہ کرنے سے اختلافات پیدا ہو گئے (زیادہ شرح فقرہ ۴۲ میں ہے)

۴۔ فوائدِ محبّت

محبت کا علم اگرچہ معرفت کے علم پر مبنی ہے مگر اوّلاً انسان محبت ہی کی جستجو کرتا ہے۔ اور اسی کے لیے معرفت کو ڈھونڈتا ہے، پھر محبت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ عمل میں استقلالؔ اور خلوصؔ پیدا کرتا ہے۔ پس معرفتؔ اور محبتؔ ایک دوسرے کے دست و بازو ہیں گویا کہ مرغِ عقل کے دو پر ہیں جن میں سے اگر ایک ٹوٹ جائے تو پرواز محال ہو جائے گی۔ اس نہایت ضروری بحث کو مثال سے واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ "نماز بے شرمی اور بے عقلی کے کاموں سے روکتی ہے"۔ یہاں یہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں نماز کیا ہے؟ (فرض کرو کہ بے شرمی اور بے عقلی کے متعلق تم کو تسلی ہے کہ وہ کیا ہیں) دوسرا سوال یہ ہے کہ "کیوں" یہ بات نماز میں ہے، اگر تم نے یہ دونوں سوال ٹھیک طور پر حل کر لیے تو کوئی شبہ نہیں کہ تمھاری نماز ٹھیک نماز ہو گئی اور وہ ضرور تمھیں برے کاموں سے باز رکھے گی، اور تم ہرگز نماز کو ترک نہ کرو گے، کیونکہ ان کاموں سے بچنے کی خواہش تمھاری فطرت میں موجود ہے۔ "قرآن پاک میں ہے کہ ایمان والوں کو خدا سب سے پیارا ہے"، خدا کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ کیوں پیارا ہے؟ اگر یہ سوالات صاف طرح پر حل ہو جائیں تو تم سچے مومن ہو جاؤ گے اور خدا تم کو سب سے زیادہ محبوب ہو گا۔ اور پھر یہ محبت دل سے ہرگز نہیں نکلے گی۔ اب خیال کرو تو معلوم ہو گا کہ "کیوں" کا پتہ "کیا" سے ملتا ہے یعنی جاننا پہچاننے سے حاصل ہوتا ہے، اگر تم کو ٹھیک طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ "خدا" کیا ہے اور ایمان کیا ہے، اور پیار کیا ہے تو یہ بات ہرگز نہ معلوم ہو گی کہ خدا کیوں ایمان والوں کو سب سے زیادہ محبوب ہے، اور جب یہ نہ معلوم ہوا تو خدا کی محبت کا حاصل ہونا بھی معلوم "کیا" اگرچہ "کیوں" کی گرہ کھولتا ہے مگر اول دل میں "کیوں"؟ ہی کا سوال پیدا ہوتا ہے اگر یہ سوال پیدا نہ ہو تو "کیا" کی جستجو نہ کی جائے۔ انسان کی تمام ترقی اسی ایک سوال میں چھپی ہے، اور انسان اور دوسرے جانوروں میں یہی چیز فرق پیدا کرتی ہے۔ فہم و تمیز، حکمت و دانائی غرض دین دنیا کے خزانوں کی کلید یہی دو چیزیں ہیں۔

۵۔ قرآن محبت و حکمت کی طرف رہبری کرتا ہے

گزشتہ بیان سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ معرفت اور محبت کی دین میں کس قدر سخت ضرورت ہے اور ہدایت اور گمراہی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اس پر زیادہ بحث کرنا فنِ منطق کا حصہ ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں۔ مگر یہ بات بے شبہ اس سے معلوم ہو گئی کہ قرآن پاک کیوں اس قدر غور و فکر و تدبر کی تاکید کرتا ہے اور کیوں یہ فرماتا ہے کہ "جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت سی نعمتیں دی گئیں" اور کیوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں بار بار کہا گیا کہ "وہ ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے گا" اور کیوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت میں آیا ہے کہ "ہم نے یہ حکمت ابراہیم کو بخشی" اور اس کے مثل بہت سی آیتیں ہیں۔

۶۔ ضرورتِ اخلاص

یہ بات تو اب معلوم ہو گئی کہ دین میں صداقت اور خلوص کس قدر ضروری ہے اور یہاں جھوٹ کی ذرا آمیزش بھی نہ رہے

اسی لیے قرآن پاک اکثر یاد دلاتا ہے کہ خدائے تعالیٰ دلوں کی سب چھپی ڈھکی دیکھتا ہے۔ اب اس خاص مسئلہ محبت الٰہی کو دیکھو، اس میں سب سے زیادہ اخلاص کی ضرورت ہے اور دوہرے اخلاص کی یعنی جب تمام دل اور عقل اور روح کو اسی کی محبت کے نذر کر دیا تو پھر ہمارے پاس کیا بچا، پس یہ تو ہماری طرف سے اخلاص ہوا یعنی جو کچھ پاس تھا سب دے دیا۔ اب اس طرف سے دیکھو کہ اگر وہ تنہا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور بھی کوئی لگا ہوا اور دوئی کی بو باقی ہے تو پھر یہ دعویٰ کہ ساری کی ساری نذر اسی ایک کو دی غلط ہو گا، اب اس دوہرے اخلاص کے حکم کے ساتھ اس کی ایسی صفات کا بتانا ضرور ہے جس سے معلوم ہو کہ ہمیں کیوں ایسا کرنا چاہیے۔

۷۔ ضرورت سورۂ اخلاص

پس اگر دین کی غرض محبت الٰہی ہے اور اگر اس محبت میں سچائی اور ثبات کی ضرورت ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس کے لیے معرفت اور محبت کی بھی سخت ضرورت ہے، اب اگر تمھیں اس ضرورت کا احساس ہے تو سورۂ اخلاص پر غور کرو، اگرچہ یہ سورہ اپنے ظاہری انداز کے لحاظ سے تمام سورتوں میں ایسی چھوٹی ہے جیسی تمام بدن میں آنکھ کی پتلی، مگر سارا عالمِ ہدایت اسی سے روشن نظر آتا ہے، محبت الٰہی کے لیے جس معرفت اور محبت کی حاجت ہے وہ ان چند آیتوں میں بکمال خوبی ظاہر کیا گیا ہے اور وہ محبت کی روشنی اور گرمی جو تمام قرآن میں پھیلی ہوئی ہے وہ یہاں ایک نقطہ پر مجتمع ہو گئی ہے۔ اگر دیگر مذاہب والے اس سورہ کو مان لیں جس کا ماننا ان پر عقل کے رو سے لازم بھی ہے تو گمراہی کی تمام ظلمت کافور ہو جائے اور دنیا خدا کے نور سے معمور ہو جائے۔ جیسا کہ ہے بھی اگر دیکھیں، چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ خدا آسمان اور زمین کا نور ہے (سورہ نور)

مسلمانوں کے نزدیک یہ سورہ ثلث قرآن ہے (اس کی شرح فقرہ ...... میں دیکھنی چاہیے) اگر یہ سورہ توریت یا انجیل میں ہوتی تو نصاریٰ ہرگز تثلیث کی مہلک بیماری میں نہ پڑتے ان کو اپنی تاریکی کے زمانہ میں اس سورہ سے اس قدر ضد تھی کہ وہ اگر کسی کو اپنے مذہب میں داخل کرتے تو اس سے نعوذ باللہ اس خدا پر لعنت کرواتے جس کی صفت اس سورہ میں بیان کی گئی ہے، مگر روشنی تاریکی پر ضرور غالب ہوتی ہے، چنانچہ ایک تو وہ زمانہ تھا اور ایک اب زمانہ ہے ...... اس سورہ کو تسلیم کرتا ہے اور مجمع نصاریٰ میں شہادت دیتا ہے کہ قرآن بے شک آسمانی کتاب ہے۔ اب یہ امر دیکھنا ہے کہ کیونکر ہم کو اس سورہ سے محبت الٰہی کے لیے کافی علم یعنی معرفت اور محبت پہچاننا اور ماننا، کیا اور کیوں حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے اول ہم کو اس کے الفاظ کو دیکھنا چاہیے کہ وہ "کیا" معنی رکھتے ہیں، اور پھر "کیا" سے "کیوں" ظاہر ہو جائے گا۔

۸۔ مضمون الفاظ سورہ

"وہ اللہ ہے" یعنی جس کی ہم بندگی کرتے ہیں وہ اللہ ہے تو قرآن پاک نے اس مقدس نام (اللہ) کا مفہوم اچھی طرح بیان کر دیا ہے، چنانچہ اس کلمہ سے مسلمانوں کے نزدیک وہ ذاتِ پاک مراد ہے جس میں تمام کمالات و محاسن جمع ہیں اور جو تمام نقائص سے پاک ہے، اس سے اعلیٰ تو کیا اس کے برابر بھی کوئی نہیں، اور یہ معانی خود اس کلمہ میں مضمر ہیں اور اکثر مواقع پر قرآن پاک نے بعد بسم اللہ

کے بطور شرح کے ایسے اسماء کا ذکر کر دیا ہے، جن سے ان معانی کی طرف رہبری ہوتی ہے (معنی اسم اللہ ملاحظہ ہو)

اگر کسی دہری کو شبہ ہو کہ یہ مفہوم کیا ثبوت ہے کہ وجود بھی رکھتا ہے؟ یہ تمھارا اپنا بنایا ہوا خیال ہے، ایسی کوئی ذات نہیں جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہو تو ہم اس سے کہیں گے کہ یہ مفہوم قرآن کی مختلف آیتوں سے لیا گیا ہے، جن میں اس دعوٰی کے دلائل بھی موجود ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ہمارا معبود وہ ہے جو جامع صفات کاملہ ہے اور اس سے جو ضروری نتیجے نکلتے ہیں ان پر آگاہ کرنا ہے۔ پس اسم مقدس کے ساتھ خیال کمال لازم ہے۔ اور چونکہ قرآن پاک میں اس اسم کی شرح میں دلائل کا ذکر بھی موجود ہے تو ہمارے دل میں یہ کلمۂ مقدس ان تمام دلائل کو بھی حاوی ہے جو اس کے ساتھ مذکور ہیں، لیکن تاکہ عذرِ نافہمی باقی نہ رہ جائے اس اسم مقدس کے بعد بطور تفصیل کے وہ صفات بیان کیے ہیں جن سے یہ شبہ اور دیگر شکوک بھی بالکل دور ہو جاتے ہیں۔

نہ صرف عرب بلکہ اکثر اقوام کے نزدیک، ایک سب سے بڑے معبود کا خیال تھا اگرچہ نافہمی سے اس کی بڑائی کا جیسا کہ زیبا ہے لحاظ نہ رکھنے سے شرک میں مبتلا ہوئے تھے (اور یہی خیال ان پر حجتِ الٰہی ہے کہ ان کی عقل کیوں الٹی ہو گئی کہ باوجود اقرارِ کمالِ الوہیت و تسلیمِ خدائے مطلق اس کے درگاہ میں دوسرے کا بھی دخل سمجھتے ہیں، عاجزی اور فروتنی جو لازمۂ عبودیت و مخلوقیت ہے اسے بھول کر بعض بندگانِ خدا کو پوجنے لگتے ہیں گویا یہ بندگی کی حد سے اوپر ہیں) پس عامۂ عرب اس اسم مقدس اللہ کے مفہوم سے بالکل ناآشنا نہ تھے البتہ اس کے اس مفہوم کی وسعت و گہرائی سے غافل تھے اور اس لیے اس سے دور جا پڑے تھے، قرآن نے اس مفہوم کو اچھی طرح پر ظاہر کر دیا اور بتا دیا کہ اس کے لوازم سے غفلت کرنا درحقیقت اس کا انکار کرنا ہے۔ جب اس طرح سے مفہوم اس مقدس نام کا معلوم ہو چکا تو بتایا گیا کہ وہ جسے ہم پوجتے ہیں، اللہ ہے۔ پس یہ ایک کلمہ ہزار کلمہ کے برابر ہو گیا۔ مثلاً اگر یہ بتا دیا گیا ہو کہ بادشاہ کے یہ یہ اوصاف ہیں تو کسی کو اس کہنے کی جگہ کہ وہ چنیں اور چناں ہے یہ ایک لفظ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ بادشاہ ہے۔

۹۔ ضرورتِ تفصیل معنی "اللہ"

اکثر جہاں غلطی سے بچانا یا کسی بات کو زیادہ دلنشین کرنا ہوتا ہے وہاں اجمال کے بعد تفصیل مفید ہوتی ہے اور چونکہ توریت اور انجیل میں خدا کے صفات مذکور تھے باایں ہمہ نصاریٰ غلطی میں پڑ گئے اور اسی طرح مشرکین بھی خدا کو سب سے اعلیٰ مانتے تھے، پھر بھی فرشتوں کو اس کے ساتھ برابر کا نہ سہی تو چھوٹے درجے کا شریک بناتے تھے۔

اس تفصیل کی سخت ضرورت تھی۔ نیز اس تفصیل کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کو معلوم ہو کہ وہ درحقیقت خدا کو نہیں پوجتے اور محض جھوٹا دعوٰی کرتے ہیں تاکہ وہ متنبہ ہوں کہ شرک نے ان کو بالکل خدا سے منقطع کر دیا۔ چنانچہ اسی مضمون کو ان سے بوقت ہجرت اور قطع تعلق کے کہا گیا تھا (سورہ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ میں اس کی بحث ہے) کہ تمھارا خدا اور ہے اور ہمارا خدا اور، اب یہاں یہ کہہ دینے سے کہ ہمارا معبود اللہ ہے ظاہر کر دیا کہ وہ لوگ دوسرا معبود رکھتے ہیں۔ پس اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ وہ محبتِ الٰہی سے بالکل محروم ہیں اسم مقدس کے مفہوم کو مفصل بیان کیا تاکہ وہ اپنی حماقت کو سمجھ کر راہ راست پر آ دیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ اسلوبِ بیان اختیار کیا جو غلطیوں کو براہ راست دور کرتا ہے، پس اگر خیالات باطلہ سے قطع نظر کی

جائے تو صرف هُوَ اللّٰه کافی ہے۔ اس سورہ کا مرکز یہی ہے اگرچہ اس کا ہر فقرہ دلربا ہے۔

۱۰۔ شرح احد

اس تفصیل میں پانچ باتیں بیان ہوئیں "بے ہمہ ہے" کوئی نہیں تھا تب بھی وہ تھا، اور اب بھی ویسے ہی بے ہمہ ہے، کلمہ "احد" جس کا ترجمہ "بے ہمہ" کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں صرف ذات پاک کی صفت میں مستعمل ہوتا ہے، اس سے یکتائی اور بے ہمتائی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے، تمام رشتہ سے پاکی اور برتری اس کا مضمون ہے، اس کلمہ کو سرسری نظر سے دیکھنا غلطی ہے۔ بنظر تدبر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ قدیم ہے اور باقی سب مخلوق ہیں، کیونکہ جو سب سے پہلے آپ ہی آپ تھا وہ ہمیشہ سے تھا اس لیے ظاہر ہے کہ جو کبھی نیست تھا وہ خود تو ہرگز ہست ہو نہیں سکتا اس لیے دو بات ماننی ضرور ہوئی ایک یہ کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور دوسری یہ کہ اس کے سوا جو ہیں وہ سب اسی کی مخلوق ہیں۔ "بے ہمگی" کے یہ دو ضروری نتیجے ہیں جن کا انکار کرنا خلاف عقل ہے۔ پس یہ کہنا کہ وہ بے ہمہ ہے یہ کہنا ہوا کہ وہ قدیم لم یزل اور خالق کل ہے۔

مشرکین کبھی یہ شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم کیونکر مان لیں کہ وہ معبود بے ہمہ ہے۔ اگر اس کے سوا کوئی اور بھی قدیم ہو تو بے ہمگی کا دعوٰی غلط ہو گا۔ اس سوال کے جواب کے لیے چند باتوں پر غور کرنا ضرور ہوگا (۱) تمام طاقتوں کا مدار ہستی پر ہے، غیر متناہی طاقت متناہی ہستی سے تناقض رکھتی ہے۔ عقل کے نزدیک "بقا" ایک ایسا اعلیٰ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس کے سامنے سب مرتبے ہیچ ہیں۔ اگر "فنا" ناتوانی کی نشانی ہے تو "بقا" کمالِ توانائی کی شہادت ہوگی (۲) اگر چند قدیم مانے جاویں تو ان میں سے کوئی بھی غیر محدود طاقت نہ رکھے گا، ملک قدرت تقسیم ہو جائے گا اور اسی طرح ملکِ تصرف بھی، ہر ایک کو ایک نئے عالم پر حکومت کرنی ہوگی۔

یک ملک دو شاہ برنتابد

اگر ایک کا تصرف ہوا پر ہوگا تو دوسرے کا پانی پر اور تیسرے کا آگ پر اور علی ہذا القیاس دو چار نہیں بلکہ جتنے چاہو خدا مان لو۔ (۳) عقل ہرگز دو متناقض باتوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ ایک ہی ذات کو محدود اور غیر محدود، کامل اور ناقص دونوں فرض نہیں کر سکتی اب بنظرِ تامل دیکھو کہ قدامت کو لازم ہے کمال اور کمال کو لازم ہے یکتائی۔ پس قدیم کو متعدد کہنا نقیضین کو جمع کرنا ہے۔

دہری کو یہ کہتے سنا کہ کچھ بھی قدیم نہیں، زمانہ کی گردش میں شام اور صبح یا رات اور دن، گرمی اور سردی، موت اور زندگی یکے بعد دیگرے چکر لگاتی رہتی ہیں، اور یہ چرخ یوں ہی چلتا آیا ہے اور چلتا جائے گا۔ اسی کو چاہو باقی کہو اور چاہو فانی۔ کاش دہری کی عقل اس گردشِ کون و فساد کو دیکھ کر خود چکرا نہ جاتی، اگر پائے فہم لڑکھڑایا تھا تو ذرا زانوئے فکر پر سر رکھتا اور سوچتا کہ یہ کیا راز ہے کہ جو چیز اپنے تئیں فنا سے بچا نہ سکی وہ فنا ہو کر کیونکر آ سکی؟ ذرا سا تخم سڑ کر درخت تناور ہو گیا اور ایک تخم نے لاکھوں بلکہ بے شمار تخم اور درخت بنا دیے۔ ایک دانہ بے حقیقت کہ جس کو جہاں چاہو پھینک دو اور جب چاہو برباد کر دو۔ پیوندِ خاک ہو کر پہلے تو فنا ہو گیا اور پھر کیا سے کیا ہو گیا۔ خود اپنے ہی آغاز اور انجام کو دیکھتا کہ کیسا بے نام و نشان تھا اور بزعمِ خود ہمہ دان ہو گیا مگر کیسی بے چارگی ہے کہ ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

پھر کیونکر اس امر پر عقل تسلی پا سکتی ہے کہ تمام نظامِ عالم جس میں ذرہ ذرہ ایک کارخانہ حکمت ہے، بلغیر کسی حکیم قادر کے چل رہا ہے، خود ہی بے چارگی کے ساتھ آتے اور جاتے ہیں اور کوئی ان پر حاکم نہیں، اگر تم کسی نئے شہر میں گزرو اور دیکھو کہ ہر کام لوگ نہایت محنت اور مشقت سے کرتے ہیں اور ہر کاریگر زبردستی آتا اور زبردستی جاتا ہے۔ کوئی اس شہر کا دائمی باشندہ نہیں تو کیا تمھیں خیال نہیں پیدا ہوگا کہ یہ شہر کسی کے تصرف میں ہے جو ان مزدوروں کو یہاں برابر بھیجتا رہتا ہے، پس یہی مثال ہے انسان اور حیوان کی زندگی کی جو بظاہر مختار اور متحرک بالارادہ ہیں، اور جن میں اس بات کی علامت پائی جاتی ہے کہ یہ کسی حاکم کے زیرِ فرمان نہیں اور جب ان کا یہ حال ہے تو وہ چیزیں جو بالکل مسخر ہو کر برابر اپنے کام میں لگی ہیں انھیں کیونکر کسی حاکم کے ماتحت نہ سمجھا جائے۔

جس طرح اس کی اولیت سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ سب کا خالق ہے اسی طرح سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ تمام نعمتیں اسی کی بخشش ہیں۔ پس وہ سب سے بے نیاز ہوا اور سب اس کے نیاز مند ہوئے اور تمام خوبیاں جو کہیں بھی پائی جائیں ان کا مبدء اور اصل وہی ذات پاک ٹھہری اس لیے ہر ایک حاجت مند اور حسن پرست کا رخ ادھر ہی ہونا چاہیے۔

۱۱- اسم اللہ کا مفہوم باپ ماں کے مفہوم سے بدرجہا ارفع ہے

اسی اولیت سے یہ بات بھی صاف ظاہر ہو گئی کہ جس قدر ہماری ذات کے ساتھ رشتے بندھے ہیں۔ مثلاً والدین، اولاد خویش اقارب، دوست دشمن وغیرہ ان سب کے علائق بمقابلہ اس تعلق کے جو ہم کو خدائے پاک کے ساتھ ہے بالکل ہیچ ہیں، عارضی، بے ثبات اور پھر طرفہ یہ کہ اسی خدا کے بخشے ہوئے۔ پس بالکل خلافِ عقل و خلافِ انصاف ہوگا کہ ہم اس اعلیٰ نسبت کو زیادہ سے زیادہ باپ کے رشتہ کے برابر سمجھیں، ہاں باپ کا تصور ایک ناقص مثال اس الصمد (باہمہ) کی ہو سکتی ہے اور مذہب کی ابتدائی الف بے سیکھنے کے زمانہ میں اس سے کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر جب اس اسم مقدس کا اعلیٰ فہم دے دیا گیا تو پھر اس کو باپ باپ کہتے رہنا صرف اسی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ باپ سے اعلیٰ مفہوم نہیں سمجھا۔ یعنی اللہ کا مفہوم نہیں پایا۔ کیسی احمق وہ لڑکی ہوگی جو عروسی کے وقت بھی اسی گڑیوں کے کھیل میں محو رہے، بے شبہ اس نے اب تک نہیں جانا کہ دولہا کسے کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس کوئی لفظ نہیں جس کو اسم مقدس کہیں، وہ ایک ہی لفظ کو اللہ اور فرشتہ اور حاکم اور امیر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جب وہ مریم علیہا السلام کو خدا کی ماں کہتے ہیں تو ہمارا دل تھرا جاتا ہے۔ اللہ اکبر کہاں شان کبریائی اور کجا یہ کودکی، اگر اسم مقدس کے مفہوم کو جانتے تو ہرگز یہ کلمہ ان کی زبان سے نہ نکلتا۔

لیکن باوجودیکہ ہمارے لیے یہ تعلق تمام رشتوں سے زیادہ دل پسند ہے کہ ع

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

تاہم اس کی "بے ہمگی" کا مفہوم ہم کو مغرور نہیں ہونے دیتا اس کی بے غرض اور بے انتہا رحمت کا شکر کرتے ہیں مگر اس کو

درجہ الوہیت سے اتار کر باپ بھائی نہیں بناتے۔ "بے ہمہ" سے جو مفہوم سب سے اول ذہن میں آتا ہے وہ یہی ہے، دوسرے مفہوم اس کے بعد ذہن میں آتے ہیں اور اس لیے گمراہی کا رستہ پہلے سے بند کر دیا ہے۔

پس جو مفہوم کہ اسم مقدس اللہ کے اندر کبریائی اور اولیت اور خالقیت مطلقہ اور رحمتِ عامہ اور حقیقی محبوبیت کا تھا وہ سب اس کلمہ سے سمجھا گیا اور یہ معانی اس سے درجہ بدرجہ حاصل ہوتے ہیں، اسی لیے پہلے معنی کے سوا دوسرے معنی اس لفظ سے بغیر تفکر اور تدبر کے سمجھ میں نہیں آتے مگر قرآن ہم کو تاکید کرتا ہے کہ تدبر اور تفکر سے کام لو اور بے شمار آیتوں میں اس کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل کی عبادت یہی ہے کہ سوچے۔ (التفکر عبادۃ العقل)

۱۲- شرح الصمد

بعضے وہ معنی جو بے ہمہ میں جھلکتے تھے اور اس سے بہ تدبر سمجھے جاتے تھے اسے باہمہ نے روشن کر دیا محض اس کی "بے ہمگی" اور بے نیازی کو خیال کر کے بعضے لوگوں نے تنگ فہمی کی وجہ سے اس کی بے شمار نعمتوں پر بھی کچھ توجہ نہ کی اور اسے ایک بے پروا گوشہ نشین علت العلل سمجھ لیا، پس ان کی غلطی دور کرنے کے لیے اس کی باہمگی کی تصریح کی حاجت ہوئی۔ خود بے شک بے نیاز ہے مگر سب کی دستگیری اور خبر گیری کرتا ہے۔ نصرت اور مدد اور تسلی کا اعلیٰ قبلہ کوئی اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا۔ تمام قوت اور تمام احسان کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ جب مانگو عطا کرتا ہے۔ مانگنے کی خواہش بھی وہی بخشتا ہے، یعنی بلوا کر بخشش کرتا ہے۔ بلکہ بن مانگے دیتا ہے لیکن اگر کوئی قبول نہ کرے تو یہ کام اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔ بندگی تو تمھیں کرو گے تمھاری طرف سے وہ بندگی نہیں کر سکتا اور تعجب آتا ہے کہ کیونکر نصاریٰ مانتے ہیں کہ اس نے خود اپنے تئیں ہمارا کفارہ کر دیا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ہماری طرف سے نیکی کر دیتا بلکہ اپنی بے انتہا نیکیوں کو ہمارا کفارہ بنا دیتا۔

۱۳- لغوی معنی الصمد

کلمہ صمد جس کا ترجمہ باہمہ کیا گیا اصل وضع میں بڑی چٹان کو کہتے ہیں اور چونکہ دشمنوں کے حملہ کے وقت اس کی پناہ پکڑتے ہیں اس لیے سردار کو جو قوم کی پشت پناہ ہو اور سب لوگ اسی کی طرف متوجہ ہوں صمد کہنے لگے، زبور اور دیگر کتب مقدسہ میں خدائے تعالیٰ کو اکثر چٹان، مدد کی چٹان کہا گیا ہے (اس کی سندیں اصل کتاب نظام القرآن میں ہیں)

۱۴- بلاغت ترکیب صفت احد و صمد

احد (بے ہمہ) اور صمد (باہمہ) دو ثبوتی صفتیں ہیں اور بظاہر متقابل ہیں مگر خدائے پاک کی تمام صفتیں ایک ہی ذات کے مختلف مظاہر ہیں۔ ایک پر غور کرو تو دوسری سب اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ مختلف صفات سے اس کو مرکب سمجھنا غلطی ہے پس جو کچھ تقابل ہے وہ بنظر ظاہر ہے جیسا کہ بے ہمہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ احد اور صمد دو صفتوں کے ساتھ ساتھ ذکر کرنے سے ظاہر طور پر ان شبہوں کو دور کر دیا جو راہ مستقیم سے ادھر ادھر ہٹا سکتے تھے اور ان بظاہر متقابل صفتوں کو مثل دو آئنہ

متقابل کے یک جا کر کے معرفتِ الٰہی کا جلوۂ کامل دکھلا دیا۔ درحقیقت چونکہ وہاں دوئی کا شائبہ نہیں ہے اس لیے ان دونوں صفتوں کو ایک ساتھ تصور کرنا اور دونوں کے اثر سے جو حالت معتدل بین الخوف والرجا پیدا ہوتی ہے اس پر ثابت رہنا نہایت مشکل کام ہے۔ صفاتِ باری میں تقابل کو جمع کرنا اس لیے مشکل ہے کہ اس کی ہر صفت غیر متناہی ہے اور اسی وجہ سے مجوسی کی عقل اس کی متحمل نہ ہوئی اور دو خدا مان لیے اور ہنود نے بلا ضرورت تین فرض کر لیے، زندگی بخشنے والا، زندہ رکھنے والا، زندگی لینے والا، مگر جب دوئی آئی کمال جاتا رہا۔ کمال کے ساتھ تقابھی رخصت ہوئی۔ پس ایک خیالِ خام کو خدا بنا لیا جس کا کچھ بھی وجود نہیں۔ معدوم محض سے جی لگا کر ہلاکت کے سوا اور کیا مل سکتا ہے۔

۱۵۔ وہ کسی کا باپ نہیں

یہ بات تو ظاہر تھی اور جو پہلے بیان کیا گیا اس میں موجود تھی مگر منظور تھا کہ شرک کی پرچھائیں ہر ایک گوشۂ تنگ سے نکال دی جائے اور وہ بھرپور روشنی جس کے لیے یہ کتاب نازل ہوئی تمام عالم کو بخشی جائے جیسا کہ عیسٰی علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دینے کے ساتھ یہ بھی بیان فرمایا کہ مجھے اور بہت سی باتیں بتانی تھیں مگر تم ابھی اس کے متحمل نہ ہو سکو گے، ہاں جب وہ روحِ حق آوے گا تمھیں تمام حق کا راستہ دکھلائے گا کیونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں بولے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور آنے والے امور کی تمھیں خبر دے گا (یوحنا ۱۶: ۱۳) اسی لیے قرآن نے حق کے کھولنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تاکہ گمراہوں کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور باطل کو کہیں منہ چھپانے کی جگہ نہ ملے۔

پہلی شریعتوں میں ہدایت بقدر تحمل دی گئی تھی جیسا کہ ابھی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے کلام میں اس کی تصریح گزری اور اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام نے آنحضرتؐ کی بشارت کے موقع پر یہودیوں کو بتایا کہ تم نے خود کامل بننا نہیں چاہا تو خدا نے بھی تم پر زیادہ بار ڈالنا پسند نہیں کیا اور فرمایا کہ میں ان کے بھائیوں میں سے ایک نبی مثل تیرے پیدا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ پس وہ انھیں تمام میری ہدایتیں سنائے گا۔" (تثنیہ ۱۸: ۱۸) چنانچہ اس آخری نبوت میں ہدایتیں اتمام کو پہنچائی گئیں اور اسی بنا پر یہاں صاف دیکھتے ہو کہ توحید کی تعلیم کس قدر خالص اور روشن کر دی گئی ہے۔

ہم کو محسوس نہیں ہوتا کہ یہ نکتہ کیوں گزشتہ امتوں کے فہم سے بالاتر تھا مگر دوسری امتوں سے پوچھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سبق انھیں اب بھی بہت مشکل نظر آتا ہے۔ مشہور مورخ گبن کی شہادت کا یہاں نقل کرنا کافی ہوگا۔ وہ کہتا ہے، "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اعتقاد گمان اور شبہ سے پاک تھا اور قرآن خدا کی توحید کی ایک عالی شان گواہی ہے۔ نبی مکیؐ نے بتوں کی اور انسانوں کی، ثوابت کی اور سیاروں کی پرستش کو اس عقلی اصول پر باطل کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب ہوتا ہے اور جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا ہے اور جو چیز بگڑ سکتی ہے وہ ضرور فنا ہو کر رہے گی۔ خلاقِ عالم کی پرستش اس کی عاقلانہ محبت نے اس اقرار کے ساتھ کی کہ وہ غیر متناہی ازلی قدیم ہے، صورت اور مکان سے منزہ ہے، نہ کوئی اس کا بیٹا ہے اور نہ مشابہ، ہمارے چھپے سے چھپے خیالات پر مطلع، اپنی ہی ذات سے واجب الوجود، اور اپنی ہی ذات سے علم اور نیکی میں کامل۔ ان اعلیٰ حقائق کو جیسا کہ اس نبی نے فرمایا اس کی امت دل سے مانتی ہے اور قرآن کے مفسروں نے ان کے معانی حکیمانہ درستی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ایک فلسفی موحد تو مسلمانوں

کے عام عقیدہ کو تسلیم کر سکے گا مگر شاید ہم لوگوں کی موجودہ فہم سے یہ بہت بلند ہے۔" گبن نے تو نہایت صفائی سے اقرار کیا کہ یہ اعلیٰ اور صحیح مفہوم اسمِ مقدس ان کی فہم سے برتر ہے مگر عملاً تمام نصاریٰ اور دیگر مذاہب والے اقرار کر رہے ہیں کہ ان کو ہنوز اس مفہوم تک رسائی نہیں ہوئی۔ کاش قرآن کی روشنی کو قبول کرتے اور بہ عوض جاہلانہ اور پست عقیدہ کے حکیمانہ اور بلند عقیدہ اختیار کرتے۔

۱۶۔ شرک تقاضائے فطرت نہیں

بت پرستی اور مردہ پرستی کا غلبہ عام طبائع پر دیکھ کر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟ اور کیا خدائے پاک کی خالص پرستش عقلِ انسانی سے بالاتر ہے؟ کیوں نصاریٰ پر ہنوز چھ صدیاں نہیں گزرنے پائیں کہ تصویر پرستی ان میں جاری ہو گئی حالانکہ توریت میں سخت ممانعت تھی اور کیوں یہود باوجودیکہ توریت کا پہلا حکم توحید تھا بارہا دل کھول کر بتوں کو پوجنے لگے؟ اور کیوں باوجودیکہ ابراہیمؑ نے محض توحید کے لیے وطن چھوڑا اور ایک سنسان جگہ جا بسے لیکن انھیں کی اولاد نے کچھ بہت مدت نہیں گزری کہ بتوں کو اسی خانۂ خدا میں لا بسایا جس کا معمار وہ پہلا بت شکن تھا؟ جب کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ خالص توحید ہی دینِ فطرت ہے اور حالاتِ مذاہبِ دیگر سے معلوم ہوتا ہے کہ خالص توحید فہمِ انسان سے بالاتر ہے تو اس سوال کا جواب دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے جہاں اس دعوٰی کا کھلم کھلا اعلان کیا ہے وہیں اس کا جواب بھی دے دیا ہے۔ پس جس نے دعوے کیا ہے اسی کا جواب بیان کرنا مناسب ہوگا ہم صرف اس کے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ سورہ روم آیات (۲۸-۴۵) میں اس دعوٰی کو کہ دینِ فطرت توحید خالص ہے بہ دلائل بیان کیا ہے۔ ان کی مفصل شرح تو اسی سورت میں دیکھنی چاہیے مگر بطور خلاصہ یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

حکمت اور رحمت کی نشانیاں جو انسان کو تمام عالم میں نظر آ رہی ہیں، اور اپنے رب کی طرف کشش جسے وہ مصیبت کے وقت محسوس کرتا ہے بتا رہی ہیں کہ کس حاکم مطلق کی ہستی پر اسے اپنے اندر اور باہر سے گواہی مل رہی ہے۔ ایسی کوئی شہادت بتوں یا مردوں کے لیے نہیں ملتی۔ مگر انسان کی فطرت شل اور حیوانات کے نہیں۔ وہ غلام بنائے گئے اور اس کو آزادی بخشی گئی جس کا لازمہ تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ترقی کرے۔ پس ان کو تو جس ڈگر پر چلانا تھا ہانک دیا اور وہ ویسے ہی چل رہے ہیں۔ مگر انسان کو چراغِ عقل اور توشۂ قابلیت دے کر میدانِ عالم میں چھوڑ دیا۔ پس اس کی فطرت اس کی قابلیت ہے۔ جس قدر انسان نے آج تک ترقی کی ہے یہ سب اس کی قابلیت ہی کے آثار ہیں اور اس کی فطرت ہی کے برگ و بار۔ یہ امر کہ قابلیت کا نام فطرت ہے کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بچۂ طاؤس جو ایک مضغۂ گوشت ہے جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پروں کی گلکاری کو ہم اس کی فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچۂ انسان جو اکثر جانوروں کی نسبت زیادہ ضعیف الجثہ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ضعیف العقل ہے جب اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو کیا اس کی دانائی اور ناتوانی کو ہم اس کی اعلیٰ فطرت کا نتیجہ نہ سمجھیں۔ پس انسان اور دیگر چیزوں میں فطرت کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ اس کی فطرت میں ایک جداگانہ بات ہے جو اوروں میں نہیں۔ یہ اول میں نہایت کمزور اور بے حقیقت ہوتا ہے مگر آخر میں سب پر فائق ہو جاتا ہے، اس کی طاقت کی تھاہ اب تک

نہیں ملی۔ مگر یہ سب دو ناتوانیوں کے درمیان ہے اور اگر یوں نہ ہوتا تو انسان سے دعوائے فرعونی بھی ناموزوں نہ ہوتا۔ پس محض اس بات سے کہ انسان کی فطرت ترقی کے بے انتہا مراحل طے کرتی ہے۔ یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستہ پر پڑ جائے۔ پس آزادیٔ رائے اور پھر درازیٔ راہ اس کے حصہ میں آئی۔ ان دو مشکلوں کے ساتھ ایک تیسری مشکل بھی لگ گئی جو ان دونوں سے کبھی جدا ہو ہی نہیں سکتی یعنی انسان نیکی اور بدی کے دوراہہ پر کھڑا کیا گیا جس کے بغیر اس کے حق میں آزادی لفظ بے معنی ہوتی تو ترقی مراتب کے لیے عرصہ تنگ ہوتا پس کوشش اور کشش انسان کے فطرت کا لازمہ ہوا اور نیکی و بدی کی کشمکش میں آگے بڑھنا اور نفس امارہ اور عقل آوارہ کو جادۂ طاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا۔

انسان کو خدائے تعالیٰ نے ان دقتوں میں ڈال کر اس کی دستگیری کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے اندر اور باہر سامانِ ہدایت موجود کر دیے۔ جس طرح بچۂ ناتوان کے لیے ماں کا آغوش مہیا کیا، اسی طرح نوع انسان کے لیے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا، جو خدا زمین مردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے، وہی خدا اپنے کلام سے ویران دلوں کو آباد کرتا ہے۔ جس طرح وہ بعضے بلند پہاڑوں میں سے قدرتی چشمے نکال دیتا ہے، اسی طرح بعض اعلیٰ دلوں میں سے الٰہی کلمے جاری فرماتا ہے۔ پس اس قدر سامان مہیا کر دینے کے بعد اگر انسان خدا سے روگرداں ہو تو یہ نتیجۂ فطرت نہیں بلکہ اس کی بے پروائی اور غفلت ہے۔ اگر تاریخ سے بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں تو اس سے کہیں زیادہ پرزور اس کے ابطال کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ توحید پر شرک کا غبار آہستہ آہستہ جمتا ہے مگر توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے جس سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ فطرتِ انسانی کو توحید سے مناسبت ہے ورنہ وہ کیوں اس طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا ہے۔

یہ مسئلہ کہ توحید داخل فطرت ہے اگرچہ ثابت ہو چکا تاہم یہ سوال باقی رہا کہ شرک کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر شرک جزو فطرت نہیں تو کم سے کم یہ بیماری اس قدر کثیر الوقوع ہے اور اسی کے ساتھ مہلک بھی کہ اس کے اسباب کا دریافت کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ اس سے محفوظ رہنا ممکن نہ ہوگا۔ تفصیل کی نہ یہاں ضرورت ہے اور نہ گنجائش بطور اصل الاصول کے یہ جاننا کافی ہے کہ شرک کے صرف دو سبب ہیں۔ غفلت اور دناءت۔ پہلا عقلی ہے اور دوسرا اخلاقی اور یہ دونوں عدمی ہیں کیونکہ غفلت اسی کا نام ہے کہ انسان خدا کی بخشی ہوئی عقل سے جو بہترین تحفہ فطرت ہے کام نہ لے۔ عقائد میں اوہام باطلہ اور اعمال میں فوائد عاجلہ کی پیروی کرے اور دناءت یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کے سر پر تاج خلافت رکھا گیا وہ ایک مخلوق کی بندگی کرے اور باوجودیکہ اس کے لیے بزم قربت میں جگہ خالی رکھی گئی اور وہ اس دخمۂ وحشت کی نیرنگیوں پر فریفتہ ہو جائے۔

۱۷۔ شرح وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ

(نہ کوئی اس کی برابری کا ہے)

بیاض[1]

[1] مصنف کے مسودہ میں یہاں سادہ صفحہ ہے، شاید آئندہ کی تکمیل کے خیال سے جگہ خالی چھوڑ دی تھی، مگر افسوس کہ وہ ہمیشہ کے لیے خالی رہ گئی۔

۱۸۔ نتائج هذا التعليم في هذه النشأة

جب وہی ذات پاک سب کا ملجا و مرکز ہے اور تمام عالم کا روئے نیاز صرف اسی ہی کی طرف ہے تو تمام بندگانِ خدا ایک ہی سطح عبودیت پر آگئے اور ہر ایک قسم کا فرق جس سے بنی آدم ایک دوسرے کے ارباب بن رہے تھے مٹا دیا گیا۔ غلام اور آقا ایک کر دیے گئے، پیغمبر اور عامۂ امت کے حقوق برابر ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فئی کو درمیان اپنے اور دیگر مسلمین کے بحصہ مساوی تقسیم کر دیا۔ انصار میں سے جب نقباء منتخب کیے تو اپنے تئیں بھی ایک نقیب قرار دیا، البتہ فطری اور ضروری فرق مراتب کا قائم رکھنا واجب تھا۔ مثلاً پیغمبر کی طاعت سب پر فرض تھی۔ ایک قسم کی بزرگی جو ادب اور قیام معاشرت کی بنا ہے ملحوظ رکھی گئی جس طرح پر ماں باپ اور استاد کا ادب فرض ہے۔ بایں ہمہ اس کو ایسی حد معتدل پر رکھا جس سے کم کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً منع کر دیا کہ میرے سامنے عجم کی طرح کھڑے نہ ہو۔ مجلس میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔ خادم سے کبھی کسی کام پر گرفت نہ کی۔ ایک شخص نے یکایک معلوم کر کے کہ آپ پیغمبر خدا ہیں لگا آداب خدمت بجا لانے تو آپ نے فرمایا کہ میں تیرے مثل ایک آدمی ہوں۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حالات دیکھو تو معلوم ہوگا کہ بادشاہی کرتے تھے مگر فقیری کے لباس میں۔ حضرت عمرؓ کا خبر رساں شتر سوار کے ساتھ ساتھ دوڑنا اور جنس کی گٹھڑی کندھے پر رکھ کر ایک معمولی عورت کے گھر پہنچانا دیکھو، اور پھر یہ کہ تین عظیم الشان سلطنتیں جو ہر ایک بجائے خود شہنشاہی روئے زمین کا دعوی کر چکی تھیں ان کے قدموں پر تاج و تخت نثار کر رہی ہیں۔ اسلام کو صبغۃ اللہ اسی لیے کہا گیا کہ اس خم یک رنگی کا اصطباغ تمام رنگوں کو مٹا دیتا ہے، یہی روحانی اصطباغ ہے، اور یہی فطرتِ انسانی ہے۔ آدم علیہ السلام کی طینت جو غبار ہو کر پریشان تھی یہاں آکر پھر مل جاتی۔ یہی خمیر گاہ نوع انسان ہے اور یہی سجدہ گاہِ ملائک۔

بر درِ میخانۂ عشق اے ملک تسبیح گو
کاندر آنجا طینت آدم مخمر می کنند

اس میخانۂ عشق کا دوسرا نام اسلام ہے جہاں جامِ توحید کا دور چلتا ہے اور اس کا جرعہ خوار کلاہ کسریٰ اور تاج قیصر کو کف پائے سے ملتا ہے۔

بر درِ میکدہ رندانِ قلندر باشند
کہ ستانند و دہند افسرِ شاہنشاہی

مگر اس بادۂ تند کے لیے ظرف چاہیے۔ جبلہ نے خلیفہ سے یہ حکم سن کر کہ اسلام نے معاشرت کی پست و بلند کو ہموار کر دیا ہے اور یہاں شاہ و گدا ایک ہی سطح پر کھڑے ہوتے ہیں، تاب نہ لا سکا اور پھر عیسائی بن گیا۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم بھی پرتو وحدت تھی اور انھوں نے مذاق عالم کو اس کی چاشنی پہلے بخش دی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی امت کے لوگ اسلام کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے فرما دیا تھا کہ اس سلطنتِ الٰہی میں شیفتگانِ متاع دنیوی کا داخل ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا کیونکہ وہاں سلطنت کے ساتھ گدائی کرنی ہوگی۔ اونٹ کو سوئی کے ناکے میں جانا ہوگا پس ان

کی تعلیم کی بنیاد ترک دولت تھی تاکہ نفس کشی کے خوگر ہو جائیں اور وقعت دولت دل سے محو ہو جائے تاکہ جب دولت دی جائے تو اس کو ہیچ سمجھیں مگر بوسیدہ اور نکمی لکڑی سے کشتیٔ نوح نہیں بن سکتی۔ حضرت کا کمال نجاری مسلم مگر افسوس کہ سامان نہ تھا اور کشتی تو کیا بنتی اس ناکارہ قوم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔

اضاعونی وای فتیً اضاعوا

۱۹۔ التوحید فی الحقوق

دین جب فطرت انسانی ہے اور انسان نے اپنی بیگانگی کو چھوڑ کر نفس واحدہ بنا لیا اور اپنی فطرت اولیٰ پر لایا گیا تو ضرور ہوا کہ ان کے لیے ایک ہی عام قانون ہو۔ شریعت موسوی میں دیکھو تو صاف معلوم ہوگا کہ لاوی قبیلہ کو خدمت گار دینی بنایا گیا اور بلاشبہ برہمنوں کی طرح ان کے حقوق مقرر کیے گئے اور جو طریق عبادت کہ وہاں قائم کیا گیا اس کے لیے ایسی ہی لازم بھی تھا، مگر اسلام نے کوئی فرقہ پجاریوں کا نہ بنایا، ہر ایک شخص اپنا آپ کاہن بنا۔ ایک اللہ اکبر قربانی کے لیے کافی تھا اور مذبح پر خون چھڑکنا اور گوشت اور چربی اور گردوں کو جلانا اور اس قسم کے احکام جو عقل کی گردن میں طوق اور زنجیر تھے اور عبادت الٰہی کے چہرہ پر نقاب ڈال رہے تھے موقوف کر دیے اور بجائے اس کے کہ آسمان پر دھواں پہنچا کر دل کو تسلی دیں کہ خدا کو ہماری نذر پہنچی یہ سچا طریق قربانی قرار دیا کہ بندگانِ خدا کو جن کے دل میں بھوک کی آگ جل رہی ہو آسودہ کرو اور ان کی شکر اور دعا اور دعا کا بخور آسمان کی طرف بھیجو۔ یہاں ہر دل مذبح قربانی ہے۔ قربانی کرنے والا اور اس کا کھانے والا دونوں ایک ہیں۔ اس لیے اس کے کھانے میں دونوں برابر ہیں۔ یہ دعوتِ الٰہی کا فطری اور حقیقی طریقہ ہے۔ وہ ذات پاک "بے ہمہ" کھانے کا وہاں کیا کام۔ پھر وہ ذات پاک "باہمہ" بھی ہے بندوں کو کھلایا تو اس کو قربانی پہنچی۔ اس دین فطرت کے تمام اعمال ایسے سیدھے اور صاف بنیاد پر رکھے گئے کہ اس میں بلندی و پستی اور پیچ و خم کی جگہ نہیں چھوڑی۔

۲۰۔ اہمیّت

مذکورہ بالا بیان کے ضمن میں یہ بات تو معلوم ہو چکی کہ یہ سورہ حقیقی اور خالص اور کمال توحید کا سبق دیتی ہے اور یہی دین اور مذہب کی جان ہے اور اس سورہ کی اہمیت اور عظمت کے لیے یہی کافی ہے لیکن اس کے اندر ایک عظیم الشان حقیقت بھی مضمر ہے۔ یعنی یہ ایک اکسیر ہے جس سے بدعات مذہبی کی مہلک بیماریوں کا استیصال ہو جاتا ہے گویا اس سورہ کی تعلیم نے مذہبی گمراہیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔ اس اجمال کو ذرا تفصیل کی ضرورت ہے[1]۔

---

[1] مصنف مرحوم نے یہاں حاشیہ میں آئندہ کی تفصیل کے لیے حسب ذیل یادداشت لکھی ہے۔

(۱) بدعت بدہیت (۲) بدعت ہندویت (۳) بدعت یہودیت (۴) بدعت نصرانیت۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مذاہب میں خدا کی ذات و صفات کے مسئلہ میں جو بدعات تھیں ان کو اس سورہ کی روشنی میں ظاہر فرماتے اور رد کرتے، مگر افسوس کہ یہ حصہ بھی ناتمام رہا۔